ممتاز حسین: مارکسزم سے روحانیت تک

محمد شفیع الدین خان*
ڈاکٹر نجیب جمال**

Abstract:

Mumtaz Hussain is considered a critic from Marxist Camp. His criticism normally used the tool introduced by a long tradition of Marxism. But in his last days of his life while writing on Bagh-o-Bahar, he diverted him self towards metaphysics. He analyzed the plot and character of this Dastan in the context of metaphysics.

۱۹۳۰ء کے عالمی اقتصادی بحران، جرمنی کے نازی ازم، اٹلی اور سپین کے فاشزم، برصغیر پر انگریزوں کے قبضے اور ۱۹۱۷ء کے عظیم انقلابِ روس نے برصغیر کے نوجوانوں کے دلوں میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نہ صرف نفرت کو جنم دیا بلکہ ان کو اس نظام کے خلاف عملی جدوجہد پر بھی اکسایا۔ کارل مارکس، اینگلز، لینن، سٹالن اور ماؤ کی تحریروں نے انکو عملی و فکری سطح پر طبقاتی سماج کی غلاظتوں کے بارے میں آگہی بخشی اور ایک غیر طبقاتی سماج کے قیام کا طریق کار سمجھنے میں مدد دی۔ ہر طرف تاریخی مادیت، جدلیاتی مادیت، طبقاتی جدوجہد، کمیونزم اور عالمگیریت جیسے موضوعات پر بحث و مباحثہ ہونے لگا۔ یہ ممتاز حسین کی طالب علمی کا زمانہ تھا انہوں نے جب کمیونزم کو سمجھنے کی کوشش

* سکالر شعبہ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور۔
** صدر شعبہ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

کی تو انہیں اس کی صداقت پر نہ صرف یقین پیدا ہوا بلکہ یہی وہ واحد نظریہ معلوم ہوا جس میں انسانیت کی ظلم و جبر، اقتصادی بدحالی، نازی ازم، فاشزم اور غلامی سے چھٹکارا پانے کی تدبیر تھی۔

۱۹۳۸ء میں جب وہ الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے کے طالب علم تھے تو وہاں بھی کمیونزم پر بحث ومباحثہ ایک معمول کی بات تھی۔ان بحث مباحثوں نے بھی ممتاز حسین کو کمیونزم کو سمجھنے میں کافی مدد کی الہ آباد میں انہیں ڈاکٹر اعجاز حسین اور فراق گورکھپوری کے علاوہ ان کو کمیونسٹ دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا جس سے ان کے اس خیال کو مذید تقویت ملی کی کہ مزدور طبقے کے انقلاب میں ہی انسانیت کا تابناک اور روشن مستقبل پنہاں ہے، جب الہ آباد سے وہ لکھنو پہنچے تو عبدالعلیم، احتشام حسین، رشید جہاں اور دیگر کمیونسٹوں نے ممتاز حسین کے کمیونزم پر یقین کو مزید پختہ کیا اور انہوں نے یہ فیصلہ کرلیا کی طبقاتی جدوجہد ہی کے ذریعے سے جبر واستحصال کا خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۴۶ء میں جب وہ بمبئی پہنچے تو ایک کمیونسٹ تھے۔کمیونزم چونکہ سماج کی سائنس ہے اس لئے ہر بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ مطالعے میں وسعت کی متقاضی رہتی ہے۔لہذا بمبئی میں سجاد ظہیر، سبط حسن، اور علی سردار جعفری کی رفاقتوں نے ممتاز حسین کی کمیونزم کے ساتھ وابستگی کو مزید مظبوط کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں عملی جدوجہد میں سر گرم کردار ادا کرنے کے سلسلہ میں حوصلہ افزائی کی۔یہی وجہ ہے کہ جب وہ بمبئی میں تھے تو کمیونسٹ پارٹی کے اخبار کے ساتھ وابستہ رہے جس کا ذکر پروفیسر وہاب اشرفی نے یوں کیا:

> ''ان کا تعلق صحافت سے بھی رہا۔چونکہ ذہن کمیونزم کی طرف تھا اس لئے انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی شاخ کے سکرٹری ہوئے اور کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار ''زمانہ'' سے وابستہ ہوئے''(۱)

بمبئی کے قیام کے دوران ان کے مضامین ''مارکسی تنقید''، ''فریب اور حقیقت''، انفعالی رومانیت'' اور ''ترقی پسند ادب'' وغیرہ ان کی کمیونسٹ انقلاب کے لئے تڑپ اور اس کے ساتھ بے مثال وابستگی کا عملی اظہار ہیں۔

ممتاز حسین نے اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے قبل ہی پڑھ لیا تھا۔رومانیت کے زیر اثر لکھے جانے والے تنقیدی مضامین بھی ان کی نظروں سے گزرتے تھے جنہیں انہوں نے تنقیدی نگاہ سے پڑھا تھا اور ان کا ایک مضمون ''انفعالی رومانیت'' جو ''نیا دور'' بنگلور میں ۱۹۴۵ء میں چھپا تھا جس میں انہوں نے رومانیت کی خامیوں اور کمزوریوں کو شدید تنقید کا نشانہ بھی بنایا تھا، رومانیت کے خلاف ایک ردعمل دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کی وجہ سے بھی پایا جاتا تھا۔اسی لئے جب ۱۹۳۶ء میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کا قیام عمل میں آیا تو اس میں بہت سارے رومانی شعراء اور ادیب بھی شامل ہوگئے تھے۔

ممتاز حسین نے افسانہ نگاری چھوڑ کر تنقید لکھنا ۱۹۴۴ء میں شروع کی اور اس وقت تک وہ کمیونزم کو ایک صداقت کے طور پر اپنا بھی چکے تھے۔ ترقی پسند نقاد ''ادب اور زندگی'' کے رشتے کی اہمیت اور سچائی کو بھی واضع کر چکے تھے۔ جس کا ذکر انہوں نے ایک انٹرویو میں یوں کیا:

''یہ زمانہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ ۱۹۳۸ء میں بی اے میں تھا اور الہ آبا ایک ایسی جگہ تھی جو سیاسی اعتبار سے بڑی اہم تھی اور ہمارے یہاں تنقید کی ابتدا ہو چکی تھی مثلاً احتشام صاحب لکھ رہے تھے، سجاد ظہیر لکھ رہے تھے، کلیم صاحب اور آل احمد سرور صاحب بھی۔ ان لوگوں کی تنقیدیں ایسی تھیں جنہیں ہم لوگ پڑھتے تھے اور مغربی ادب کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ میں ایسی یونیورسٹی میں تھا جہاں مغربی ادب کے مطالعے پر خاص طور پر زیادہ زور دیا جاتا تھا چنانچہ میں نے بھی اس قسم کی کتابیں پڑھیں اسطرح ہمارا ذہن بن رہا تھا چنانچہ اس نئی تنقید جسے ادب اور زندگی کے رشتے متوازن کرنے کا نام دیا جاتا تھا۔ شروع ہو چکی تھی۔''(۲)

ممتاز حسین مارکسی نظریات کا اطلاق تنقید پر کرنے والے پہلے نقاد نہیں تھے جیسا کہ وہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سہیل احمد خان اور کشور ناہید کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ سجاد ظہیر، احتشام حسین اور عبدالعلیم وغیرہ پہلے سے مارکسی نظریات کی روشنی میں ادب کو پرکھ رہے تھے۔ ایک اور سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

''میں اور میرے رفقا اور ہماری طرح سوچنے والے اس نئی تنقید کی طرف آئے جسے ترقی پسند تنقید کہا گیا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ کسی تحریک کی ابتدا کے لئے کوئی سن مخصوص نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے ۱۹۳۶ء کا حوالہ بتایا جاتا ہے مگر ترقی پسند تنقید اس سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اختر حسین رائے پوری کا مضمون اس سے پہلے ہی شائع ہو گیا تھا۔ ملک کی عام سیاسی اور فکری فضا میں ادب کے رویے کیطرف ایک تبدیلی محسوس کی جا رہی تھی۔''(۳)

ممتاز حسین اپنے خیالات اور نظریات کی تشریح اور وضاحت کے لئے ہی افسانہ نگاری چھوڑ کر تنقید نگاری کی طرف آئے۔ ان کے خیال میں اس طرح وہ ایک ایسا ادب تخلیق ہونے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں جو زندگی کی ترقی، خوشحالی اور عظمت کا کام سرانجام دے سکے۔ جو طبقاتی جدوجہد کو ابھار سکے اور ایک غیر طبقاتی سماج کے قیام کی راہ ہموار کر سکے۔ وہ کشور ناہید کو بتاتے ہیں:

''باقاعدہ تنقید ۱۹۴۴ء میں لکھنی شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خیالات متعین ہو چکے تھے

اور میں اپنے خیالات کی تشریح اور وضاحت کے رشتے ہی سے اپنی معاصر تخلیقات کو پرکھتا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ عمل تخلیقی عمل ہے۔''(۴)

ممتاز حسین کے نزدیک کمیونسٹ نظریات کی کامیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ادیب، نقاد، شاعر یا دانشور معاشرے کو بدلنے کے لئے عصر حاضر پر اثر انداز ہوں اپنے نظریات کی روشنی میں سماجی تضادات کو دیکھیں، پرکھیں اور مزید ابھاریں تا کہ لوگ اس معاشرے کو جو لوٹ گھسوٹ پر مبنی ہے اس کو بدلنے کو اٹھ کھڑے ہوں لیکن اس کے لئے آپ کو معاشرے کی صورت حال پر اثر انداز ہونا پڑے گا۔ اور وہ بھی اسی مقصد کے لئے تنقید پر مارکسی نظریات کا اطلاق کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کے آخری انٹرویو میں جو انہوں نے مشرف احمد کو دیا تھا میں وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''درسی تنقید دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو مدرسوں میں جواب مضمون کے طور پر کسی شاعر یا افسانہ نگار پر مضمون کو کہا جاتا ہے۔ دوسری وہ ہوتی ہے جو خالصتاً اکیڈمک، یہاں اکیڈمک سے میری مراد علمی سے ہے۔ مگر اس سے یہ بات واضع نہیں ہوتی۔ لفظ اکیڈمک کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بالکل ہی غیر جانبدار ہوتی ہے اور مقررہ اصول اور ضوابط کے تحت کسی مصنف، ادب یا کسی شاعر و ادیب کی تخلیق کو پرکھتی ہے۔ تو ہر چند کہ اکیڈمک تنقید کا جاننا بھی ضروری ہے لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا اگر آپ کی دلچسپی، اگر آپ کے جذبات اور حوصلے کچھ اس قسم کے ہیں کہ آپ اپنے معاشرے کی صورتحال پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں۔ اس کو بہتر کرنا چاہتے ہیں تو پھر آپ اکیڈمک نہیں ہو سکتے۔ آپ کو اس دائرے سے باہر نکلنا ہوتا ہے اور اپنے لئے کوئی نیا راستہ، کوئی نئی فکر تلاش کرنا ہوتی ہے جس کے ساتھ آپ کی کمٹ منٹ بھی ہو جاتی ہے۔''(۵)

ممتاز حسین ایک مارکسی نقاد کے طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ ایک نقاد کو مصنف اور ادب پارہ کو اس زمانے اور سماجی فکر کی روشنی میں پرکھنا چاہیے۔ بقول ممتاز حسین:

''اگر آپ تنقید کو پُر مایا بنانا چاہتے ہیں اور اسے سرسری رکھنے کے درپے نہیں ہیں تو آپ کو مصنف کی زندگی، اس کے زمانے کی سماجی فکر، ثقافت، تہذیب، سب کا علم ہونا چاہیے۔''(۶)

۲۷، ۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء کو بھیمڑی میں منعقد ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس میں انجمن کے منشور میں کچھ تبدیلیاں لائی گئیں۔ چونکہ انجمن کی ۱۹۳۶ء میں تشکیل کے بعد ہی ایک بحث اندرونی حلقوں میں

جاری تھی کہ ادب میں کمیونسٹ نظریات کی برملا نشر و اشاعت کی جائے یا نہیں، ابتدائی دنوں میں چونکہ انجمن کے بانیوں کے خیال میں زیادہ سے زیادہ ادیبوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے محض ترقی پسندی کی بات کرنا اور آزادی کی بات کرنا ضروری تھا اس لئے ادب میں کمیونسٹ نظریات کا کھلے عام تذکرہ و تشہیر کرنے کے عمل کو ملتوی رکھا گیا۔لیکن یہ بحث جاری رہی۔اس بحث کے دوران ممتاز حسین بھی ان لوگوں میں شامل تھے جو کمیونسٹ نظریات یعنی غیر طبقاتی سماج کے قیام کیلئے ادب پاروں میں طبقاتی جدوجہد کو ابھارنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے، ممتاز حسین کا مضمون جو ''سویرا ۵، ۶'' میں بعنوان ''ترقی پسند ادب کیا ہے'' چھپا تھا جو اس دلیل کا واضح ثبوت ہے:

> ''ہم اس جنگ کو انہیں طاقتوں کے ساتھ رہ کر لڑ سکتے ہیں جنہوں نے ترقی پسندی کے خیال کو جنم دیا۔۔۔۔۔۔ ہم ترقی پسند ادب کو عوامی جنگ سے الگ کر کے نہیں بچا سکتے، ہم غیر جانبدار رہ کر اس کی حفاظت نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ ہم نیشنلزم کے پردے میں طبقاتی حقیقت کو چھپا کر اسے نہیں بچا سکتے۔۔۔۔۔ آج انسانیت کی نجات صرف اشتراکی نظام میں ہے۔''(۷)

یہ بحث جاری تھی کہ چین میں سرخ انقلاب یقین میں بدل گیا، جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کی تحریکوں نے کمیونسٹ انقلاب کو ایک حقیقت میں بدل دیا، روس کے مرد آہن جوزف سٹالن نے اپنی ہمت، جرات اور صداقت سے یہ ثابت کیا کہ ایک عالمی کمیونسٹ سماج کی تشکیل ممکن ہے، اس کے علاوہ دنیا کے مزدوروں اور غریبوں کو جوزف سٹالن کے طبقاتی پس منظر کی وجہ سے یہ یقین بھی ہو گیا کہ مزدور طبقے کا کوئی فرد حکمران بھی بن سکتا ہے ان سب واقعات نے ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' میں ان افراد کے نقطۂ نظر کو تقویت بخشی جو چاہتے تھے کہ جن مقاصد کے حصول کے ایک ذریعے کے طور پر انجمن بنائی گئی تھی اس کا برملا اظہار کیا جائے لہذا انجمن نے کمیونزم کو ترقی پسند ادب کا نصب العین قرار دے دیا۔

ممتاز حسین جو کہ ''انسانیت کی نجات صرف اشتراکی نظام میں دیکھتے تھے اور ترقی پسند ادب کو عوامی جنگ کے ساتھ جوڑنے'' کے خواہش مند تھے کو ترقی پسند نقادوں سے چند باتوں پر اختلاف تھا مثلاً ماضی کے ادب اور شاعری میں، رمز و اشاریت کے حوالے سے، وہ اختلاف علمی و فکری سطح پر ختم کیا جانا چاہیے تھا۔مگر چند ناعاقبت اندیش لوگوں نے اس اختلاف کو علمی، ادبی اور فکری سطح پر حل کرنے کی بجائے خود کو عقل کل سمجھ لیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ممتاز حسین تحریک سے بدظن ہونا شروع ہو گئے۔ممتاز حسین پاکستان آنے کے بعد بھی انجمن کے مقاصد کو پوری دیانت داری کے ساتھ پھیلانے کے لئے کوشاں رہے، پاکستان بھر کے دورے کیے ترقی پسند ادیبوں کو اکھٹا کیا۔۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۲ء میں انجمن ترقی پاکستان کی دو سالانہ کانفرنسیں کرانے میں سرگرم کردار ادا کیا، قید و بند کی

صعوبتیں برداشت کیں لیکن انہوں نے ۲۴ اگست ۱۹۵۳ء کو انھوں نے اپنی کتاب ''نئی قدریں'' کے حرف اول میں ایک چونکا دینے والی بات کی:

''ان مضامین میں حرف آخر کہنے یا سیر حاصل بحث کرنے کی بجائے موضوعات کو ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔اور وہ نقطۂ نظر کم از کم میرے بہت سے ساتھیوں کے لئے نیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے بہت نیا ہے بلکہ کچھ لوگوں کے لئے پرانا ہو گیا ہے تو مجبوراً ہمیں بھی کہنا پڑے گا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ خود پرانے ہو گئے ہیں کیونکہ نئے اور پرانے کا فرق پرانے کے ''نئے پن'' میں نہیں۔ بلکہ تاریخی قوتوں کے نئے اور پرانے پن میں ہے۔اگر کچھ لوگ کبیر سنی میں بچوں ایسی چھل کرنے لگیں تو اس سے ان کی کبیر سنی کو عہد طفولیت کا نام دیا جا سکتا ہے اس کے ساتھ یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جب جوان کسی منزل پر آ کر اڑ جاتا ہے یا میکانکی طریق سے عمل کرنے لگتا ہے تو وہ بھی جوان نہیں رہتا تخلیقی مارکسزم کٹر مارکسزم سے انہی معنوں میں ممتاز ہے۔تخلیقی مارکسزم میکانیت، سہل پسندی، کٹر پسندی کے خلاف ہے اور اگر کسی قسم کی کوئی خامی میری تحریر میں ہے تو وہ میری ہے نہ کہ مارکسزم کی۔اس میں شبہ نہیں کہ ابھی اس نظام علم کی روشنی میں ادبی مظہر کو سیر حاصل طریقے سے جانچا نہیں گیا اور ابھی ادب کے بہت سے گوشے اس کی روشنی کی زد میں نہیں آئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ادبی مظہر کو کسی اور نظام علم سے جانچا جا سکتا ہے کیونکہ دوسرے علم جہاں دوسرے میدانوں میں اپنی بے بظاعتی کا اعتراف کر چکے ہیں اس میدان میں بھی شکست خوردہ نظر آتے ہیں۔''(۸)

یہاں ممتاز حسین اپنی اس پرانی ''ترقی پسند ادب کیا ہے'' والی روش سے ہٹنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ماکسزم سے ''تخلیقی مارکسزم'' کی طرف قدم اٹھاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ ادبی مظہر کو جانچنے کا معیار صرف ماکسزم ہی متعین کر سکتا ہے کوئی اور نظام یا فکر یہ استطاعت نہیں رکھتی۔اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ماکسزم کو ہی ایک سچا اور حقیقی نظام حیات اور نظام نقد ادب سمجھتے ہیں لیکن کسی حد تک اپنی انفرادیت کو ''تخلیقی مارکسزم'' کے نام پر قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سردار جعفری کے مضمون ''ترقی پسند شاعری کے بعض بنیادی مسائل'' جو ''شاہراہ ۱۹۴۹'' میں چھپا تھا جس میں جب بقول ڈاکٹر ابوارشد اعظمی:

''سردار جعفری کے اس مضمون نے نئے لکھنے والوں کے سامنے مسلہ کو اور الجھا

> دیا۔فیض، جذبی، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز حسین اور خواجہ احمد عباس جیسے شاعروں اور ادیبوں کو۔۔۔۔مشتبہ قرار دیا۔''(۹)

تو ممتاز حسین نے اپنی ایک انفرادی پہچان بنانے کے خیال سے ''تخلیقی مارکسزم'' کی اصطلاح کو اپنی تحریروں کی بنیاد قرار دیا ہو۔

ممتاز حسین کا ایک مضمون ''معروضات'' جو کہ ماہنامہ ''قومی زبان''، کراچی کے جولائی ۱۹۹۲ء کے شمارے میں چھپا تھا اس میں انہوں نے خود کو آزاد خیال قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

> ''تاریخ، انسانی ذہن کی ترقی کا ایک لمبا سفر ہے اور ہر دور میں ترقی پسندی کی صورت مختلف رہی ہے اس کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے لیکن بمبئی کی ترقی پسند انجمن میرے اس مضمون (کچھ ماضی کے ادب عالیہ کے متعلق) سے برہم ہوئی اور اس نے میرے اس مضمون کے خلاف ایک مضمون لکھوا کر شائع کروا دیا چنانچہ میں نے اس کا جواب بہ عنوان ''ایک ڈیمو گاگی کا تجزیہ'' لکھ کر ''شاہراہ'' دہلی میں چھپوا دیا۔۔۔۔۔اس میں میں نے ان لوگوں کے غلط خیالات کا تجزیہ پیش کیا۔میرے ذہنی سفر کا یہ ایک زبردست موڑ تھا، چنانچہ اس وقت سے آزادئی خیال کا میں شدت سے حامی رہا ہوں۔۔۔۔۔میری تنقید Multi Disciplinary ہے۔یورپ ہو یا مشرق، گوئٹے ہو یا غالب سب سے فیض اٹھاتا ہوں جہاں کوئی اچھی چیز ملتی ہے اور میرا دل اس پر ٹھکتا ہے اسے میں قبول کرتا ہوں۔''(۱۰)

کمیونزم سے ''تخلیقی مارکسزم'' اور پھر آزادئی خیال تک کا یہ سفر ممتاز حسین کی ان تحریروں کی شان تو کم نہیں کر سکتا جن میں دکھی انسانیت کے دکھ درد کا مداوا کرنے کے جتن کیے گئے تھے اور نہ ہی ان کی ان خدمات کو جھوٹے عناد کیاندھیروں میں چھپا سکتا ہے جو انہوں نے ترقی پسند ادبی تنقید کو عظیم اور ابدی بنانے کے حوالے سے سرانجام دی تھیں۔

جوزف سٹالن کی وفات کے بعد نہ صرف عالمی کمیونسٹ تحریک کو شدید جھٹکا لگا بلکہ ترمیم پسندی اور اصلاح پسندی پر مبنی کھوکھلے افکار بھی کمیونزم کی اصل روح کو تباہ کرنے لگے وہ مزدور طبقہ جس نے زار شاہی کو صفحۂ ہستی سے مٹایا۔جاپانیوں کے حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور ظفر مند ہوئیں، جس نے ہٹلر کو ناکوں چنے چبوائے اور اپنے طاقت، ہمت اور سچائی کو دنیا کے سامنے ثابت کیا جب اس مزدور طبقے کی بجائے انقلاب کو بچانے کے لئے ''کم برے حکمرانوں'' سے اتحاد کو ضروری قرار دے دیا گیا تو عظیم سوویت انقلاب سرمایہ داری کی طرف سرکنے لگا۔سرمایہ داروں کے ایجنٹوں یعنی خروشچیف سے لے کر گورباچوف تک نے بھی سوشلزم کے کمیونزم کیطرف بڑھنے کے عمل کو اپنی بوسیدہ سوچ اور کھوکھلی تحریروں سے روکا اور یوں سرمایہ دار طبقے کو قوت اور توانائی بخشی جس کی بدولت وہ یہ کہنے

میں کامیاب ہوگئے کہ کمیونزم تو کھوکھلا تھا اس لئے باقی نہیں رہا۔

کمیونزم کھوکھلا نہیں تھا بلکہ وہ لوگ بوسیدہ تھے جنہوں نے ترمیم پسندی اور اصلاح پسندی کو روس میں رواج دے کر دنیا بھر کے مزدوروں، ادیبوں اور دانشوروں کو مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں دھکیل دیا۔ممتاز حسین کی مایوسی اور خود کو''آزادئ خیال'' کا حامی قرار دینے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے

ممتاز حسین نے جب ''رسالہ در معرفت استعارہ'' جیسا اہم مضمون لکھا تو کچھ لوگوں نے کہا ممتاز صاحب صوفی ہوگئے۔اس کے علاوہ جب ۱۹۵۸ء میں باغ و بہار کا مقدمہ لکھتے ہوئے درویشوں کے سفر کو روحانی سفر قرار دیتے ہوئے انہیں بے نیازی کے ساتھ مقامات عشق سے گزارا تو اس نے تو انہیں روحانیت کا مبلغ ٹھہرا دیا اور اس پر طُرح یہ کہ جب انہوں نے احمد ندیم قاسمی کی نظم ''انسان عظیم ہے خدایا'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

> ''یہاں احمد ندیم قاسمی کی فکر علامہ اقبال کی فکر سے زیادہ ہوجاتی ہے۔یوں تو علامہ اقبال بھی حلاج اور محی الدین ابن العربی کے خیالات سے کافی متاثر تھے اور انہوں نے بھی انسانی عظمت کے ترانے گائے ہیں لیکن جب وہ امام غزالی اور مجدد الف ثانی سرہندی کے ہاتھوں پر بیعت کر لیتے ہیں اور اس رو میں مادی فلسفے سے کنارہ کش ہونے لگتے ہیں تو وہ اپنے عظیم انسانوں کو نیابت الٰہی کا کچھ ایسا پابند کردیتے ہیں کہ ان کی ساری پرواز بے معنی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔۔۔۔قاسمی نے اس متشرع صوفیانہ روایت سے علیحدہ اپنی راہ نکالی ہے وہ دور حاضر کے اس طبقے کو اپنے خالق کے پہلو میں بٹھانا چاہتا ہے جس سے سینہ گیتی میں نور چمکا۔''(۱۱)

ممتاز حسین کے ان الفاظ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سہیل احمد خان لکھتے ہیں:

> ''ممتاز حسین نے تصوف سے بھی دلچسپی لی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہے۔تصوف کے بارے میں بھی انہوں نے اپنے دور کی بعض غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔صوفیانہ تحریکوں اور''کرگھے'' میں انہیں ایک رشتہ نظر آتا ہے دست کار طبقوں کی محنت اور انسانی اخوت کی تحریکیں انہیں ہم آہنگ لگتی ہیں۔یہاں ہی تصوف کی جزوی قبولیت بہر حال اس دور کے عمومی رجحان سے علیحدہ ہے۔''(۱۲)

ممتاز حسین کی تحریروں میں لفظ''روحانی'' اور''روحانیت'' وغیرہ کافی آتے ہیں۔وہ انسان کو''روحانی حقیقت'' بھی قرار دیتے ہیں اور اسکی وضاحت میں لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح ہم دوسری چیزوں کو استعمال میں لاتے ہیں اس طرح ہم انسان کو استعمال نہیں کر سکتے۔دراصل ممتاز حسین روحانی جہت کے بھی قائل رہے ہیں۔لیکن اس روحانی جہت جس کو وہ اکثر اپنی تحریروں میں لاتے ہیں کو وہ پیری فقیری سے الگ رکھتے ہیں، وہ

انسان دوستی کے قائل تھے اور ان کے خیال میں انسان دوستی تصوف یا روحانیت میں پائی جاتی ہے۔اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر سحر انصاری لکھتے ہیں:

''روحانیت سے ان کی مراد پیری فقیری نہیں ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ سماجی تعاون میں انسان ایک دوسرے کا محتاج ضرور ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی غیر کے جلب منفعت کا ایک آلہ کار ہے اس کے سماجی تعاون کی صحیح بنیاد یہ ہے کہ ہر فرد کی تکمیل ذات دوسروں کی تکمیل ذات پر مشروط ہے ممتاز حسین نے اس میں بطور خاص لکھا ہے کہ ''انسان ایک روحانی حقیقت ہے'' ۔۔۔۔۔ممتاز حسین کی مارکسی فکر کا یہ روحانی رخ بہت اہم ہے۔۔۔۔۔۔ یہ سلسلہ استعارہ کی معرفت میں بھی ہے۔اور غالب سے ہوتا ہوا امیر خسرو تک پہنچتا ہے لیکن کہیں بھی ان کے یہاں روحانیت کا وہ عام مفہوم مترشح نہیں ہوتا جسے صوفیوں کے حوالے سے پیش کیا جاتا ہے ان کے خیال میں انسان میں روحانی بیداری اس ذات اور پستی کے شعور سے پیدا ہوئی ہے کہ وہ جو کہ مسجود ملائک ہے اپنے رزق اپنے مقدر اپنی فطرت کا خالق ہے اسے مٹھی بھر زرداروں کی ٹولی نے منجملہ ''اسباب پیداوار'' کے رقم کر دیا ہے، یہ مسجود ملائک والی بات ان کی فکر اور انسانی دوستی کا ایک اہم وقتی مسلہ تھا۔۔۔۔انہیں مولانا روم، حافظ، میر، غالب اور اقبال کی شاعری کا یہ رخ سب سے زیادہ عزیز تھا۔اس میں انہیں حرکت، جذبہ عمل اور تقدیر آفرینی سب کچھ نظر آتا ہے اور اسی میں وہ بہتر انسانی مستقبل کو ممکن الوقوع پاتے ہیں۔'' (۱۳)

ممتاز حسین روحانیت کی طرف اپنی رغبت کی تردید کہیں بھی نہیں کرتے بلکہ وہ تو اپنی مادی فکر کے ساتھ جڑی ہوئی روحانیت کا جواز مارکس ہی کے حوالے سے ''مارکسی جمالیات'' میں پیش کرتے ہیں اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مارکس نے تمام فنون لطیفہ اور ادب کی تمام اضاف کو روحانی تخلیقات کا نام دیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام بعض تخلیقات آرٹ اور شاعری کے حق میں مہلک ہے سرمایہ دارانہ نظام کیوں آرٹ اور شاعری کے حق میں مہلک ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس نظام میں تمام انسانی رشتے زر کے رشتوں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور شاعری اور آرٹ کا تعلق انسانی رشتوں کی مصوری سے ہے۔۔۔۔۔۔۔افادہ پرست بنتھم کے نزدیک تو ادب اور فن کی اتنی بھی استعمالی قدر نہ تھی جتنی ایک پن کشن کی ہوتی ہے لیکن مارکس نے فنون اور ادب کو روحانی تخلیقات قرار دے کر اسے استعمالی قدر کے تصور سے آزاد کرایا۔'' (۱۴)

حوالہ جات

۱۔ وہاب اشرفی، پروفیسر،''مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور ادب''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۳۰۴

۲۔ ممتاز حسین،''ادب اور روح عصر''، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۷، ۱۵۸

۳۔ ایضاً، ص ۱۵۶، ۱۵۷

۴۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۸۰، ۱۸۱

۶۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۷۔ ''سویرا ۶۰۵''، ترتیب؛ ظہیر احمد کاشمیری، احمد راہی، نظیر چوہدری، (مضمون :''ترقی پسند ادب کیا ہے''، از ممتاز حسین)، ص ۱۷

۸۔ ممتاز حسین،''نئی قدریں''، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۵۳ء، ص ۵، ۶

۹۔ ابوارشد اعظمی، ڈاکٹر،''ترقی پسند تنقید، تظرہ و عمل''، ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی ۲۰۱۰ء، ص ۷۰

۱۰۔ بحوالہ؛ سہ ماہی فنون، لاہور، مدیر احمد قاسمی، شمادہ ۳۷، ستمبر، دسمبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۱، ۳۵

۱۱۔ ممتاز حسین،''ادب اور روح عصر''، ص ۱۵

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ ارحقاق ممتاز، مرتبہ، ڈاکٹر جمال نقوی، پروفیسر ممتاز حسین اکیڈمی، ۲۰۱۲ء، ص ۰۵

۱۴۔ ممتاز حسین،''مارکسی جمالیات''، آکسفورڈ، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۴۱، ۴۶